ڈاکٹر کلیم احمد عاجز
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

نگار سجاد ظہیر ☆

۱۹۷۵ء کے لگ بھگ کلیم عاجز نے کہا تھا۔

ابھی کلیم کو پہچانتا نہیں کوئی
یہ اپنے وقت کی گدڑی میں لعل ہے پیارے

چند سال بعد اُنہوں نے کہا۔

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا؟
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

اور پھر اپنے فن کے نصف النہار میں اُنہوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ایک دبستان کے بانی ہیں۔ ان کے ناقدین اسے کلیم عاجز کی شاعرانہ تعلّی کہیں گے اور معترفین حقیقتِ حال کی ترجمانی!

تقریباً بائیس سال اُدھر کی بات ہے جولائی ۱۹۹۲ء میں میری کلیم عاجز سے پہلی ملاقات ہوئی تو اس وقت تک وہ خاصے معروف ہو چکے تھے۔ امریکہ، کناڈا، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب مشاعروں میں بلائے جاتے تھے۔ ریاض (سعودی عرب) ان کی آمد کے موقع پر ان کے اعزاز میں ایک بڑی تقریب سیّد ابوظفر کے گھر پر منعقد ہوئی۔ ان دنوں میں ریاض میں ہی تھی۔ وہاں کی تھکی، ٹوٹی سماجی زندگی میں اس وقت ہل چل مچ جاتی تھی جب کوئی شاعر، ادیب یا دانشور چند روزہ قیام کی غرض سے ریاض پہنچتا، پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ ہر ایک انہیں اپنے غریب خانے یا دولت کدے پر مدعو کرتا اور غیر ملکی

☆ پروفیسر (ر) ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، سابق صدر شعبہ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی، کراچی۔

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

کچھ ہی عرصہ میں پی ایچ ڈی کے لیے اُنہوں نے مقالہ مکمل کرلیا اور داخل دفتر کردیا۔ آخر کار جامعہ کراچی کے بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز اینڈ ریسرچ کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۲۰۰۵ء میں ان کے لیے پی ایچ ڈی کی ڈگری منظور کی گئی۔ اس طرح اگلے عہدہ پر ترقی کے لیے ایک شرط تو پوری ہوگئی البتہ مقالات کا مقررہ تعداد میں اشاعت کا معاملہ مدت طلب کام تھا جس کی تکمیل میں تقریباً ۹ سال مزید لگ گئے۔

یہ تو مقدرات ہیں، پی ایچ ڈی کا معرکہ سر ہونے کے چند ماہ بعد ہی انہیں یکم جولائی ۲۰۰۶ء کو والدہ صاحبہ کے انتقال کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ یہ صبر کی منزل تھی اس کے بعد وہ مقالات کی تعداد کو جلد سے جلد پورا کرنا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے انتقال سے تقریباً ایک ماہ پہلے، تمام شرائط مکمل ہوجانے کے بعد، انہیں پروفیسر شپ کے اگلے عہدہ پر ترقی کی خوشی نصیب ہوئی۔ جامعہ کی طرف سے اسی سلسلہ میں تقرری کی اطلاع انہیں غالباً جمعہ ۵ ستمبر ۲۰۱۴ء کو ملی اسی روز یہ مسرت آمیز اطلاع ٹیلیفون پر انہوں نے خاکسار کو دی اور اتوار ۷ ستمبر ۲۰۱۴ء کی شام میرے گھر پر آئے اور ایک بڑا سا کیک ساتھ لائے۔ خوشی خوشی پیش کیا۔ کچھ دیر سینہ سے لگے رہے پھر سر جھکا کر بیٹھے اور ہمیشہ کی طرح یہ اعتراف کیا کہ ''سر لکھنا پڑھنا تو میں نے آپ سے سیکھا ہے۔ جب بھی میں کسی موضوع پر لکھنے بیٹھتا ہوں تو سب سے پہلے آپ کی کوئی کتاب، کتابچہ یا مقالہ اُٹھا کر دیکھتا ہوں تو مجھے روشنی مل جاتی ہے اور پھر میرا ذہن کام کرنے لگتا ہے۔''

اُس دن وہ بہت خوش تھے، ہونا بھی چاہئے تھا، طبیعت بھی ٹھیک تھی۔ آئندہ کے لیے کام پر بات ہوئی اور یہ عزم بھی ظاہر کیا کہ آئندہ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کی طباعت کے لیے اہتمام کروں گا، فی الحال اس میں کتابت کی اور دوسری بہت سی اغلاط ہیں انہیں درست کروں گا۔ اپنی ایک اور زیر ترتیب کتاب کے لیے مضمون کی درخواست کی اور پھر خوشی خوشی معانقہ کر کے چلے گئے۔

منگل ۹ ستمبر کو شعبہ میں بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ میں شرکت کے لیے جامعہ کراچی گیا، خیال تھا کہ میاں شکیل صدیقی سے ملاقات ہوسکے گی۔ ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ یونیورسٹی نہیں آسکیں گے۔ بس یہی وہ 'آخری بات' آخری ملاقات تھی جس کے بعد بس خبریں ہی ملتی رہیں اور بمشکل ۲ ہفتہ گذرے تھے کہ وہ آخری خبر بھی مل گئی جس کے بعد کوئی خبر نہیں ہوتی۔

خبر جو یہ دل ویران کرگئی۔

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

تارکینِ وطن کے لیے ریاض کی سوئی ہوئی زندگی چند دنوں کے لیے اتھل پتھل کا شکار ہو جاتی۔

ڈاکٹر کلیم عاجز نے عمرہ کی غرض سے بھارت سے ریاض کے راستے جدہ جاتے ہوئے جب ریاض میں مختصر قیام کیا تو اہلِ ریاض کی بن آئی۔ سیّد ابوظفر نے پاکستانی اور ہندوستانی کمیونٹی کی علم وادب سے وابستہ چیدہ چیدہ شخصیات کو ڈاکٹر کلیم عاجز کے ساتھ شام منانے کی دعوت دی۔ محفل کی صدارت کلیم عاجز کے شریکِ سفر سیّد محسن باغزال نے کی تھی اور نظامت کے فرائض پاکستان سے تعلق رکھنے والے شاعر قمر حیدر قمر نے انجام دیئے۔

تقریب کے آغاز سے قبل سیّد ابوظفر نے مجھے کلیم عاجز صاحب سے ملوایا، یہ میری ان سے پہلی اور آخری مختصر ملاقات تھی۔ وہ کم گو تھے، بلکہ بہت ہی کم آمیز اور مجھے بھی احتراماً کم سخنی کا مظاہرہ کرنا تھا، وہ مجھ سے میری مصروفیات کے حوالے سے گفتگو کرتے رہے، کیونکہ میرا تفصیلی تعارف سیّد ابوظفر ان سے کرا چکے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ اُنہوں نے پھر مجھے عرصہ تک یاد رکھا کیونکہ جب بھی ان کی کوئی کتاب آئی اور جب بھی وہ ریاض آئے، میری عدم موجودگی کے باوجود، اُنہوں نے سجاد کو اپنی کتابیں دیں، جو مجھ تک پہنچیں اور میرے مطالعہ میں رہیں۔

ڈاکٹر کلیم عاجز نحیف الجثہ بزرگ تھے، عمر تقریباً ستر برس رہی ہوگی۔ سیاہ شیروانی، پاجامہ اور سیاہ کشتی ٹوپی ان کا لباس تھا، پتلا، قدرے سانولا، باریش چہرہ، سنہری فریم کی عینک کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی، متین، مشفق آنکھیں، اسلامی تہذیب میں ڈھلے ہوئے، خوبصورت لہجے کے شاعر ڈاکٹر کلیم عاجز کو اس تقریب میں دل کھول کر سنا گیا۔ ابتداء میں انہیں خطاب کی دعوت دی گئی تو اُنہوں نے مختصر خطاب کیا، جس میں اُنہوں نے غالب، میر اور اقبال کے حوالے سے بات کی، خصوصاً اقبال کی شاعری کے اس پہلو پر بات کی کہ اُنہوں نے کس طرح اسلامی پیغام کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، یہی ان کے کلام کا وزن ہے۔ آخر میں اُنہوں نے بڑی منکسر المزاجی سے کہا کہ میں محافلِ شعر وسخن میں داد وصول کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ اپنا پیغام پہنچانے کے لیے شرکت کرتا ہوں۔

نصف شب سے بھی زائد جاری رہنے والی اس تقریب میں ریاض میں مقیم جن پاکستانی اور ہندوستانی شعراء نے اپنا کلام سنایا، ان میں قمر حیدر قمر، راشد فضلی، نگار سجاد ظہیر، نجمہ شاہین نجمی، میر فراست علی خسرو، سیّد حنیف اشعر، عذرا نقوی، مرزا سلطان بیگ، علی عباس اشعری، شمس الحق نوشاد، رشید صدیقی، اقبال اعجاز بیگ، کاوش عباسی اور مشتاق شاد کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں، اس کے بعد کلیم عاجز صاحب کو دعوتِ کلام دی گئی۔ شرکاء نے فرمائش کر کر کے ان کی کئی مشہور غزلیں سنیں جن میں ''تم تتل کرے ہو کہ کرامات کرے ہو'' اور ''جاناں جاناں'' بھی شامل تھیں۔ ایک تو ان کی غزلیں، دوسرا ان کا ترنم، کسی کو بھی گہری ہوتی رات کا ہوش نہیں تھا۔ ریاض کی چند یادگار اور کامیاب تقاریب کے طور پر وہ تقریب آج بھی مجھے یاد ہے۔ اس تقریب کی پریس کوریج بھی بہت ہوئی، میرے خزانے میں بھی اس تقریب کی کئی تصاویر موجود ہیں۔

ڈاکٹر کلیم عاجز اس کے بعد بھی کئی دفعہ جدہ گئے، عمرہ کی ادائیگی کے لیے وہ تقریباً ہر سال جدہ جاتے رہتے، لیکن ریاض آنا کم ہوا۔ جنوری ۲۰۰۳ء میں جب وہ ریاض آئے تو اُنہوں نے اپنی کتاب **کوچۂ جاناں جاناں** سجاد (مرحوم) کو دی، اس پر اُنہوں نے لکھا تھا ''جناب سجاد ظہیر اور جنابہ بیگم نگار سجاد ظہیر کے لیے'' نیچے ان کے دستخط اور ۹ر جنوری ۲۰۰۳ء کی تاریخ تھی۔

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

اُس کے دو دن بعد ۱۱ر جنوری کو ایک اور مشاعرے میں سجاد کی ان سے ملاقات ہوئی، اس موقع پر اُنہوں نے اپنا شعری مجموعہ جب فصلِ بہاراں آئی تھی عطا کیا، اس پر لکھا تھا "ڈاکٹر سجاد ظہیر اور ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کے لیے"۔

ہم تو سر کو تلھتی پر رکھے رکھے پھرتے ہیں
اور یہ بات اس شہرِ ستم کا قاتل قاتل جانے ہے

نیچے ان کے دستخط اور ۱۱ر جنوری ۲۰۰۳ء کی تاریخ۔ (قارئین "تلھتی" کو ہتھیلی نہ پڑھیں۔)

کلیم احمد عاجزؔ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کو پٹنہ سے متصل قصبے تلہاڑہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور پھر نانا سے حاصل کی۔ باضابطہ اسکول کی تعلیم پٹنہ مسلم اسکول سے حاصل کی۔ ناموافق حالات کی وجہ سے ان کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ ٹوٹ کر چلتا رہا۔ تیس سال کی عمر میں بی۔ اے (آنرز) میں داخلہ لیا، اردو میں ایم۔ اے کیا۔ اسکول سے یونیورسٹی تک بدرجہ اوّل کامیاب ہوتے رہے۔ ان کی پی۔ ایچ۔ ڈی کا موضوع "بہار میں اردو شاعری کا آرتقاء ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۶ء" تھا۔

ان کی زندگی کے ابتدائی سولہ سترہ سال سکون اور خوش حالی کے برس تھے، ماں باپ کا سایہ سر پر تھا، چار بھائیوں اور تین بہنوں پر مشتمل یہ کنبہ تلہاڑہ کے قصبے میں یوں زیست کر رہا تھا کہ غم کا کوئی سایہ نہ تھا۔ والد کے انتقال کے بعد مسائل کا آغاز شروع ہوا۔ اگست ۱۹۴۶ء میں بڑا بھائی بھی داغِ مفارقت دے گیا اور دو ماہ بعد ہونے والے بہار کے فرقہ وارانہ فسادات نے تو ان کی دنیا ہی اجاڑ دی۔ جب ان کی بستی "گنج شہیداں" بن گئی، بقرعید سے ایک دن پہلے ۳ر نومبر ۱۹۴۶ء کو بہار کے فرقہ وارانہ فسادات نے تلہاڑہ کی بستی میں مسلمانوں کا صفایا کر دیا۔ کلیم عاجز کی والدہ امت الفاطمہ اور پندرہ سالہ چھوٹی بہن کے ساتھ ساتھ خاندان کے مزید ۲۳ افراد بے دردی سے تہہ و تیغ کر دیے گئے۔ اس وقت کلیم عاجز قصبے سے باہر تھے، لہٰذا بچ گئے۔ گھر، خاندان اور پھر گاؤں کی تباہی کا یہ دکھ ان کی سانسوں میں گندھ گیا تھا۔

حقیقتوں کا جلال دیں گے صداقتوں کا جمال دیں گے
تجھے بھی ہم اے غمِ زمانہ غزل کے سانچے میں ڈھال دیں گے

وہ خود لکھتے ہیں "۴۶ء سے ۵۰ء تک سوائے سوچنے اور خلاء میں دیکھنے کے کوئی کام ہی نہ رہا۔ بس بیٹھے ہیں تو بیٹھے ہیں، کھڑے ہیں تو کھڑے ہیں۔" وہ گیارہ سال تک اپنی بستی تلہاڑہ واپس نہیں گئے۔ وہ بستی جہاں کئی مسلم گھرانے آباد تھے، مسجد تھی، مدرسہ تھا، غالباً خانقاہ بھی تھی، وہاں سے مسلمانوں کا ایسا صفایا کیا گیا کہ پھر نصف صدی تک نہ وہاں کوئی مسجد بن سکی نہ خانقاہ۔ اُس ایک دن نو سو مسلمانوں کو سفاکی اور درندگی سے قتل کر دیا گیا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان تھے اور مسلمان اپنے لیے ایک علیٰحدہ وطن کا مطالبہ کر رہے تھے۔

ان فسادات میں اُنہوں نے اپنا خاندان، پورا اثاثہ اور جمی جمائی معیشت کھو دی۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۶۰ء تک تقریباً چودہ سال انہوں نے ایسی زندگی گذاری جس کی کوئی تمنا نہ کرے۔ وہ پٹنہ میں محنت مزدوری کر کے بیوی اور چار بچوں کا پیٹ پالتے

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

رہے۔ ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ اسی کے اوپر ان کی رہائش تھی۔ دوکان میں خود جھاڑو دینا اور صفائی کرنا، مشین پر لحاف، توشک سی کر، روئی بھر کر فروخت کرنا۔ کئی دفعہ ایسے حالات ہوئے کہ ع

آج کھانے کو اور نہ سونے کو
جی بہت چاہتا ہے رونے کو

۱۹۶۰ء میں کلیم عاجز نے مولانا الیاس کی تبلیغی جماعت میں شمولیت اختیار کی۔ ان کے گھر کا ماحول شروع سے مذہبی تھا۔ ان کی والدہ اور نانا، حضرت شاہ عبدالقادر، سجادہ نشین، خانقاہ اسلامپورہ سے بیعت تھیں۔ گھر میں مذہبی شخصیات کا آنا جانا رہتا، خانقاہ سے وابستگی ورثے میں ملی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ کے بعد پہلا حج کیا اور پھر متعدد بار حاضریاں ہوئیں۔ اسی سال لکچرر کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے، اس وقت ان کی عمر چالیس بیالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ایک معزز پیشہ سے وابستگی نے زندگی میں رفتہ رفتہ ٹھہراؤ پیدا کیا۔ زیست کی تلخیاں آہستہ آہستہ ڈھلنے لگیں، علمی و ادبی حوالوں سے ان کی شناخت بننے لگی۔ عزت، شہرت اور آسودگی نے قدم بوسی کی، لیکن ''کوچۂ قاتل'' کو ترک نہ کرنے کی وجہ سے بار بار قتل ہوئے۔ ۶۴ء اور ۷۹ء میں فسادات جمشید پور میں بہت سے دوستوں اور عزیزوں کو کھو دیا۔ ۷۱ء کے سانحۂ سقوط ڈھاکہ میں اپنے بہنوئی، کئی دوسرے عزیزوں کے ساتھ اپنے بہت سے خواب بھی کھو دیئے۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب کوچۂ جاناں جاناں کا انتساب ملاحظہ کیجئے۔

''میں اپنے اس مجموعۂ نظم کا انتساب اپنے وطن ہندوستان سے کرتا ہوں کو میرا کوچۂ جاناں ہے، جس کی صرف ایک خصوصیت پوری توانائی اور صحت مندی سے باقی ہے کہ ۔

شہر خالی ہوا نہ قاتل سے
ایک جاتا ہے ایک آتا ہے''

ڈاکٹر کلیم عاجز کی عطا کردہ ان کی دونوں کتابوں میں سے میں نے پہلے جب فصلِ بہاراں آئی تھی کا مطالعہ کیا۔ یہ ان کا شعری مجموعہ ہے جس میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۹ء تک کی تقریباً ایک سو تے غزلیں شامل ہیں۔ اس کتاب کا مقدمہ کم و بیش سو صفحات پر محیط ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اس طولانی مقدمہ کو ''مختصر'' کہتے ہیں۔ اپنی بھانجی ریحانہ کو خط میں لکھتے ہیں،

''.....میں نے تقریباً سو صفحات کا مختصر دیباچہ لکھ دیا ہے۔'' (پھلو نہ ڈکھے گا .....صفحہ ۹۰) اس مقدمہ کو پڑھتے ہوئے کئی مقامات ایسے آئے جب کلیم عاجز خود اپنی شاعرانہ خوبیاں بتانے لگے، خود اپنا ممدوح بن جانا خاصی بدمذاقی کی بات ہے۔ یہ بد مذاقی ڈاکٹر کلیم عاجز نے دوسری کتابوں میں بھی کی ہے۔

ان کا یہ شعری مجموعہ پڑھتے ہوئے کئی بار ایسا لگا کہ میر کو پڑھ رہے ہیں ۔

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

کون یہ نغمہ سرا میرؔ کے انداز میں ہے

غالب کو ان کے اندازِ بیاں نے بڑا شاعر بنایا اور میرؔ کو ان کے لہجے نے۔ کلیم عاجز کا بھی لہجہ اہم ہے۔ ان کا سہل ممتنع، جو ان کی پوری شاعری پر چھایا ہوا ہے، میرؔ کی یاد دلاتا ہے۔ ان کی بعض غزلوں کے تیور اُسی سوز و گداز سے روشناس کراتے ہیں جو میرؔ کا خاص حصہ تھا۔

بیاں جب کلیم اپنی حالت کرے ہے — غزل کیا پڑھے ہے قیامت کرے ہے
بھلا آدمی تھا پہ ناداں نکلا — سنا ہے کسی سے محبت کرے ہے
قبا ایک دن چاک اس کی بھی ہوگی — جنوں کب کسی کی رعائت کرے ہے

غزلوں کے ہجوم میں ان کی غزل الگ ہی پہچانی جاتی ہے۔ اُنہوں نے اس راستے پر نئے چراغ جلائے ہیں ۔

نہ ساتھ دیں گی یہ دم توڑتی ہوئی شمعیں
نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے

عام طور پر وہ بھاری بھرکم تراکیب، عربی اور فارسی یا سنسکرت کے مشکل الفاظ، ثقیل اور غیر مانوس زبان استعمال نہیں کرتے، اُنہوں نے غزلوں میں اپنی بولی اور اپنا لہجہ برتا ہے اور خوب برتا ہے۔ ان کی ہر غزل کا کوئی نہ کوئی ذاتی، ملکی، قومی یا ملی پس منظر ہے، اس حوالے سے ہندوستان بلکہ جنوبی ایشیا کی تاریخ ان کی شاعری میں محفوظ ہوگئی ہے۔

ان کی دوسری کتاب جو میں نے پڑھی کوچۂ جاناں جاناں تھی۔ ان کی یہ کتاب ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ نعتوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ ہر نظم کا ایک خاص پس منظر ہے، جو اُنہوں نے نظم سے پہلے بیان کیا ہے۔ یہ بیانیہ کہیں چند سطور کا ہے اور کہیں چند صفحات پر محیط ہے، یوں یہ صرف نعتوں، نظموں کا مجموعہ ہی نہیں، نثر پارے بھی اُتنی ہی تعداد میں موجود ہیں۔

ان دو کتابوں کے علاوہ سجاد کے توسط سے مجھے ان کی تین اور کتابیں موصول ہوئیں۔ ایک ان کا مجموعہ مضامین **میری زبان میرا قلم** جو ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا، ناشر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ہیں۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اوّل میں ان کے انیس مضامین، چھ مختصر سفرنامے، پانچ انٹرویو جو مختلف اوقات میں مختلف ممالک میں لیے گئے، شامل ہیں۔ دوسری جلد میں ۳۹ مضامین شامل ہیں۔ ان تاثراتی مضامین میں منطقیانہ اسلوب، فلسفیانہ موشگافیاں نہیں ہیں، الفاظ کے طوطا مینا بھی نہیں ہیں، سیدھی سادھی تحریریں ہیں، بلکہ بہت سیدھی سادھی، مکالمے کے انداز میں لکھتے ہیں، جیسے کسی سے بات کر رہے ہوں یا خود بڑبڑا رہے ہوں۔ یہ ان کا نثری اسلوب ہے، مترادفات سے البتہ رنگ جمانے کی کوشش میں خوانخواہ کی بات بڑھاتے ہیں اور الفاظ ضائع کرتے ہیں۔ وہ جتنے کم سخن، کم گو اور کم آمیز تھے، اتنے ہی بسیار نویس رہے۔

ان کی ایک اور کتاب جو سجاد نے مجھے سعودی عرب سے بھجوائی **پھلو نہ دُکھے گا**..... تھی۔ یہ ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جو اُنہوں نے اپنی بھانجی ریحانہ کو جنوری ۱۹۷۱ء سے ستمبر ۲۰۰۱ء کے دوران لکھے۔ ان خطوط میں ادبی معرکے نہیں، عالمانہ بحثیں

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com